اسوۂ ابراہیمی۔ قرآن کی روشنی میں

محمد رضی الاسلام ندوی

حضرت ابراہیمؑ کا شمار ان انبیاء کرام میں ہوتا ہے جن کا تذکرہ قرآن میں کثرت سے آیا ہے۔ آپؑ کا ظہور ایک ایسی قوم میں ہوا جو مشرک اور مظاہر پرستی میں غرق تھی۔ اس نے سینکڑوں دیوی دیوتا بنا رکھے تھے۔ آپؑ نے منصب نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد اسے توحید کی دعوت دی۔ شرک اور اس کے مظاہر پر زبردست تنقید کی اور عوام الناس کو غیر اللہ کی بے بسی اور بے بضاعتی کا عملی مشاہدہ بھی کروایا۔ لیکن آپ کی قوم ایمان نہ لائی بالآخر اس پر اتمام حجت کر دینے کے بعد آپ نے اپنے وطن سے ہجرت کی اور دوسرے علاقوں میں اللہ کی دعوت عام کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ بڑھاپے میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اولاد سے نوازا تو اسے لے جا کر ایک "بے آب و گیاہ وادی" میں بسا دیا تاکہ وہ جگہ مستقبل میں توحید کا مرکز بن جائے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؑ کی نسل میں برکت دی اور آپ کی دعوت بھی خوب پھلی پھولی۔ اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ آج دنیا کے تین بڑے مذاہب یہودیت، مسیحیت اور اسلام کے ماننے والے آپ ہی سے شرف انتساب رکھتے ہیں۔

قرآن کریم میں حضرت ابراہیمؑ کی دعوت کو بہت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور آپؑ کی ملت کی پیروی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک دوسرا پہلو بھی ہے جو کم اہمیت کا حامل نہیں ہے وہ یہ کہ قرآن نے آپ کے ذاتی اوصاف بھی نمایاں کئے ہیں اور آپ کی نجی زندگی کو بھی اسوہ بنا کر پیش کیا ہے۔ سورۂ ممتحنہ (آیت نمبر ۴) میں ہے:

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْ إِبْرَاهِيْمَ (الایہ)

تم لوگوں کے لئے ابراہیمؑ میں ایک اچھا نمونہ ہے۔

اس مقالہ میں اسی پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے اور قرآن کی روشنی میں حضرت ابراہیمؑ کے ذاتی اوصاف پر بحث کی گئی ہے۔

ا۔ شرک سے بیزاری (حنفیت)

حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کا سب سے نمایاں اور امتیازی وصف ان کا شرک وبت پرستی سے برأت، بیزاری ونفرت اور خدائے واحد پر ایمان ہے۔ ان کی پیدائش اور پرورش ایک ایسی قوم میں ہوئی جس میں بت پرستی اور ستارہ پرستی عام تھی۔ سینکڑوں دیوی دیوتاؤں کو خدائی میں شریک کر لیا گیا تھا اور ان کے سامنے جبین نیاز خم کی جاتی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے شعور کی آنکھیں کھولیں تو انہیں اس ماحول میں سخت گھٹن محسوس ہوئی۔ ان کی فطرت نے انہیں توحید تک رہنمائی کی۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے انہیں منصب نبوت سے سرفراز کیا تو انہوں نے قوم کو راہِ ہدایت کی طرف بلانے کے ساتھ ساتھ شرک سے اپنی بیزاری اور برأت کا بھی اعلان کر دیا۔

يَاقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ٥ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ١ ۔ (الانعام ۷۸۔۷۹)

اے برادرانِ قوم: میں ان سب سے بیزار ہوں جنہیں تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو۔ میں نے تو یکسو ہو کر اپنا رخ اس ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

ان کی قوم بحث ومجادلہ کے درپے ہوئی تو اس کی بھی انہوں نے مطلق پرواہ نہ کی اور اس سے دوٹوک انداز میں کہہ دیا:

اَتُحَآجُّوْنِّیْ فِی اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰانِ وَلَآ اَخَافُ مَاتُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ (الانعام: ۸۰)

کیا تم لوگ اللہ کے معاملہ میں مجھ سے جھگڑتے ہو؟ حالانکہ اس نے مجھے راہِ راست دکھادی ہے اور میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے نہیں ڈرتا۔

حضرت ابراہیمؑ کا یہ حال نبوت کے بعد ہی کا نہ تھا بلکہ وہ اپنی ابتدائی زندگی ہی سے فطرت سلیم پر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں رشد وہدایت کے جادہ مستقیم پر قائم رکھا تھا چنانچہ ارشاد ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا اِبْرَاهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عَالِمِيْنَ (الانبياء: ۵۱)

اس سے پہلے ہم نے ابراہیم کو اس کی ہوش مندی بخشی تھی اور ہم اس کو خوب جانتے ہیں۔

اس آیت میں 'رشد' سے اگرچہ بعض مفسرین نے نبوت مراد لی ہے لیکن اکثر مفسرین کے نزدیک اس کا

مطلب ہدایت، معرفت الٰہی، ہوشمندی اور راست روی ہے "من قبل" کی بھی دو توجیہیں کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے مراد ہے، حضرت موسیٰؑ سے پہلے، جن کا تذکرہ ما قبل آیات میں موجود ہے۔ دوسری یہ کہ اس سے ابتدائی عمر کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو بچپن ہی سے رشد و ہدایت سے نوازا تھا۔ پہلی توجیہ حضرت ابن عباسؓ سے اور دوسری ان کے شاگرد حضرت مجاہدؒ سے منقول ہے۔ (۲) مفسرین میں سے ابن جریر طبریؒ نے پہلی اور ابن کثیرؒ نے دوسری توجیہ کو اختیار کیا ہے (۳)۔ بعد کے مفسرین نے ان دونوں توجیہوں کو نقل کر دیا ہے یا ان میں سے کسی ایک کو اختیار کیا ہے۔ (۴) اس کی بعض اور توجیہیں بھی کی گئی ہیں۔ (۵)

حضرت ابراہیمؑ کے اس امتیازی وصف کو نمایاں کرنے کے لئے قرآن نے متعدد تعبیریں اختیار کی ہیں۔ سورہ صافات میں ہے۔

وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ (الصافات: ۸۳. ۸٤)

اور اس کے (یعنی حضرت نوحؑ کے) طریقے پر چلنے والا ابراہیم تھا جب وہ اپنے رب کے حضور قلب سلیم لے کر آیا۔

مذکورہ آیت میں حضرت ابراہیم کو پاکیزہ دل کہا گیا ہے بعض مفسرین نے اس کا عام مفہوم مراد لیا ہے۔ یعنی ایسا دل جو تمام اعتقادی و اخلاقی خرابیوں سے پاک ہو۔ اس کی دلیل انہوں نے یہ دی ہے کہ یہاں یہ لفظ مطلق آیا ہے اس لئے اسے کسی ایک معنی کے لئے خاص کرنا مناسب نہیں (٦)

جب کہ بعض دیگر مفسرین کے نزدیک اس سے مراد ہے شرک کی آلودگی سے پاک دل۔ اس کی دلیل یہ ہے مابعد آیات میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کے شرک میں مبتلا ہونے پر ان کی مذمت کی ہے (۷)۔ ابن عباسؓ، مجاہدؒ، قتادہؒ، حسنؒ، سدیؒ وغیرہ سے بھی یہی تاویل مروی ہے (۸)

حضرت ابراہیمؑ کی حق پرستی اور شرک سے بیزاری کو نمایاں کرنے کے لئے قرآن نے ایک لفظ "حنیف" کا استعمال کیا ہے۔ یہود و نصاریٰ میں سے ہر ایک، باوجود اپنی تمام گمراہیوں اور صریح شرک کے دعویٰ کرتا تھا کہ صرف وہی حضرت ابراہیمؑ کے بتائے ہوئے طریقے پر ہے۔ اس کے جواب میں ان سے کہا گیا:

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ٥ (آل عمران: ٦٧)

ابراہیم نہ یہودی تھا نہ عیسائی بلکہ وہ تو ایک مسلم یکسو تھا اور وہ ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھا۔

لفظ 'حنیف' کا مادہ حنف ہے۔ لغت میں اس کے اصل معنی کیا ہیں؟ اس سلسلہ میں ماہرین لغت سے دو اقوال منقول ہیں: ایک یہ کہ اس کے معنی مائل ہونے اور جھکنے کے ہیں۔ عربی زبان میں احنف اس شخص کو کہتے ہیں جس کے دونوں پیر مڑے ہوئے ہوں۔ اس اعتبار سے حنیف کے معنی ہوں گے وہ شخص جو ہر طرف سے کٹ کر صرف اللہ کے دین کی طرف مائل ہو۔ دوسرا قول یہ ہے کہ احنف کے معنی سیدھا ہونے کے ہیں۔ عربی زبان میں لنگڑے کے لئے احنف کا لفظ اچھے شگون کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے متعدد الفاظ ہیں جنہیں بر عکس مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً جس شخص کو کوئی موذی کیڑا، سانپ بچھو وغیرہ کاٹ لے تو اسے 'سلیم' (لفظی معنی نجات پانے والا) اور کھائی کو مفازۃ (لفظی معنی جائے نجات) کہا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے حنیف اس شخص کو کہا جائے گا جو ٹھیک اللہ کے دین پر قائم ہو اس سے سرِ مو بھی انحراف نہ کرے (۹)۔

بہر حال ان میں سے جو معنی بھی اختیار کئے جائیں، قرآن کی اصطلاح میں حنیف سے مراد وہ شخص ہے جو شرک سے بالقصد اعراض کر کے اسے بصیرت کے ساتھ ترک کرے اور حق کی طرف رجوع کرے۔ اس طرح پر کہ اسے کوئی چیز حق قبول کرنے سے باز نہ رکھ سکے (۱۰) یہ لفظ قرآن میں دس مقامات پر آیا ہے ان میں سے آٹھ مقامات پر اس کا استعمال حضرت ابراہیمؑ کے لئے ہوا ہے اور ایک جگہ کے علاوہ سب جگہوں پر اس کے بعد **وما کان من المشرکین** یا اس جیسے الفاظ بھی آئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا استعمال شرک کے بالمقابل ہوا ہے۔

۲۔ کامل اطاعت الٰہی

حضرت ابراہیمؑ کی پوری زندگی نگاہوں کے سامنے ہو تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے پورے طور پر خود کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع کر دیا تھا اور اس کے ارشادات واحکام پر عمل پیرا ہونے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ جب تک اللہ تعالیٰ نے انہیں وطن میں رہ کر دعوت کا مشن جاری رکھنے کا حکم دیا وہ سخت سے سخت حالات کی پرواہ کئے بغیر اس فریضہ کو سرانجام دیتے رہے جب ان کی قوم نے آبائی دین کی توہین کے جرم میں انہیں آگ میں ڈال دیا تو اس موقع پر بھی انہوں نے بے مثال استقامت کا مظاہرہ کیا اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے گھر بار، خاندان اور وطن کو چھوڑ کر ہجرت کرنے کا حکم دیا تو اس حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ بڑھاپے کی عمر کو پہنچنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک فرزند سے نوازا جو مستقبل کا سہارا، امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز تھا۔ جب اسے اپنی ماں کے ساتھ بے آب وگیاہ وادی میں بسانے کا حکم دیا تو اس پر بھی پس وپیش کا مظاہرہ نہیں کیا۔ پھر جب اس دشت غربت میں اس اکلوتے اور محبوب فرزند کی گردن پر چھری پھیر دینے کا اشارہ ملا تو اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے بھی اپنی

آستینیں چڑھالیں گویا حضرت ابراہیمؑ کی زندگی اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت، خود سپردگی اور نفس کو مرضیٔ مولا کے تابع کردینے کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

قرآن نے اسی چیز کو لفظ اسلام سے تعبیر کیا ہے۔

اِذْقَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ (البقرہ ۱۳۱)

اس کا حال یہ تھا کہ جب اس کے رب نے اس سے کہا "مسلم ہو جا" تو اس نے فوراً کہا "میں مالک کائنات کا مسلم" ہو گیا۔

اسلام کے لفظی معنی اطاعت و فرماں برداری، خضوع و خود سپردگی اور اخلاص کے ہیں۔ مسلمان کو 'مسلم' اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی اطاعت کے لئے ہمہ وقت آمادہ رہتا ہے(۱۱) زید بن عمرو بن نفیل' جن کا شمار عہد جاہلیت کے نفاء میں ہوتا ہے' ان کے دو اشعار ہیں۔

وَاَسْلَمْتُ وَجْهِي لِمَنْ اَسْلَمَتْ لَهُ الأَرْضُ تَحْمِلُ صَخْرًا ثِقَالا

وَاَسْلَمْتُ وَجْهِي لِمَنْ اَسْلَمَتْ لَهُ الْمُزْنُ تَحْمِلُ عَذْبًا زُ لاَ لاَ ۱۲

ترجمہ: میں نے اس ذات باری کے آگے اپنا سر تسلیم خم کر دیا ہے جس کے حکم پر زمین بھاری چٹانوں کو اٹھائے ہوئے ہے اور بادل میٹھا پانی لے کر ادھر ادھر جاتے ہیں

مذکورہ بالا آیت میں حضرت ابراہیمؑ کی زبان مبارک سے اظہار اطاعت کا بیان ہے مگر آیت کو اسی محدود معنی تک رکھنا صحیح نہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے نہ صرف زبان قال سے فرمانبرداری کا اظہار کیا بلکہ زندگی کے ہر ہر لمحے میں زبان حال سے اس کا ثبوت بھی فراہم کیا۔ راغب اصفہانی نے لکھا:

"اسلام کے لئے محض زبانی اعتراف کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ضروری ہے کہ دل میں وہی بات ہو جس کا زبان سے اظہار کیا جارہا ہے' عمل سے بھی اس کی تصدیق ہو۔ اللہ تعالیٰ نے جو فیصلے کر دیئے ہیں اور جو چیزیں مقدر کر دی ہیں ان کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا جائے جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کے سلسلہ میں مذکور ہے(۱۳)"

حضرت ابراہیمؑ کی اطاعتِ الٰہی کا نقطۂ عروج ہمیں واقعۂ ذبح میں نظر آتا ہے۔ خواب میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے بیٹے کو ذبح کرنے کا اشارہ پا کر وہ فوراً اس پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ بیٹے سے اس خواب کا ذکر کیا تو اس نے بھی احکام الٰہی کے سامنے اپنی جبین نیاز خم کر دی۔ دونوں کی اس کیفیت کو قرآن نے لفظ 'اسلام' سے تعبیر کیا ہے۔

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ ○ وَ نَادَیْنٰہُ اَنْ یّٰٓاِبْرٰهِیْمُ ○ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْیَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ" (الصافات: ۱۰۳-۱۰۵)

آخر کو جب ان دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور ابراہیمؑ نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرادیا اور ہم نے ندا دی کہ اے ابراہیمؑ تو نے خواب سچ کر دکھایا۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔

بائیبل میں بھی حضرت ابراہیمؑ کی اللہ کی اطاعت اور رضا طلبی کا بارہا تذکرہ آیا ہے: "خدا نے ابرہام سے کہا کہ اپنے وطن اور اپنے ناتے داروں کے بیچ سے اور اپنے باپ کے گھر سے نکل کر اس ملک میں جا، جو میں تجھے دکھاؤں گا۔ سو ابرہام خدا کے کہنے کے مطابق چل پڑا (۱۴)

"خداوند فرماتا ہے چونکہ تو نے یہ کام کیا کہ اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے۔ دریغ نہ رکھا اس لئے میں نے بھی اپنی ذات کی قسم کھائی ہے کہ میں تجھے برکت دوں گا۔۔۔۔۔۔ کیونکہ تو نے میری بات مانی (۱۵)

(یسوع۔(حضرت عیسیٰ) نے کاہنوں سے کہا)"میں تمہارے خلاف پکار کر کہتا ہوں کہ تم شیطان کی اولاد ہو نہ کہ ابرہام کی جس نے خدا کی محبت میں اپنے گھر کو چھوڑ دیا اور اپنے بیٹے کو ذبح کرنے پر تیار ہو گیا"(۱۶)

"خدا کے کہنے کے مطابق" "تو نے میری بات مانی" "خدا کی محبت میں" جیسے الفاظ سے حضرت ابراہیمؑ کی کامل اطاعت الٰہی اور مرضیٔ رب کے آگے خود سپردگی کا اظہار ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کے جذبۂ اطاعت اور مکمل فرمانبرداری پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے بھی مہر تصدیق ثبت کر دی گئی ہے۔ قرآن کہتا ہے:

وَ اِبْرٰهِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰی (النجم: ۳۷) اور ابراہیم جس نے وفا کا حق ادا کر دیا۔

دوسری جگہ ہے:

اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِیْفًا وَّ لَمْ یَكُ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (النحل ۱۲۰)

واقعہ یہ ہے کہ ابراہیم اپنی ذات میں ایک پوری امت تھا۔ اللہ کا مطیع فرمان اور یک سو۔ وہ کبھی مشرک نہ تھا۔

قنوت کے معنی اطاعت گزاری اور تابع داری کے ہیں۔ حضرات صحابہؓ میں سے ابن عباسؓ اور ابن مسعودؓ اور حضرات تابعین میں سے مجاہدؒ اور قتادہؒ نے قانت کی تشریح 'مطیع' سے کی ہے (۱۷) راغب اصفہانی نے لکھا ہے: "خضوع کے ساتھ اطاعت کرنے کو قنوت کہتے ہیں"(۱۸)

اس آیت میں لفظ 'امۃ' کے کیا معنی ہیں؟ اس سلسلہ میں اہل تفسیر سے مختلف اقوال مروی ہیں:

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ امت سے مراد وہ شخص ہے جو لوگوں کو اچھائی کی تعلیم دیتا ہے۔

حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں : لفظ امۃ اپنے معروف معنی میں ہے۔ اپنے عہد میں حضرت ابراہیمؑ تنہا مومن تھے بقیہ تمام لوگ کافر تھے اس بنا پر انہیں تن تنہا ایک امت قرار دیا گیا۔

حضرت قتادہؒ کے نزدیک اس کے معنی امام کے ہیں (۱۹)

متاخرین میں مولانا فراہیؒ نے امۃ کو اطاعت گذار کے معنی میں لیا ہے اور اس کے معنی کی تعیین میں بعض جاھلی اشعار سے استشہاد کیا ہے ۲۰۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی وفاداری' بے کم وکاست اطاعت اور خود سپردگی کا صلہ یہ دیا کہ انہیں رہتی دنیا تک کے لئے امام بنادیا۔ قرآن کہتا ہے :

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (البقرہ: ۱۲۴)

یاد کرو کہ جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ ان سب میں پورا اتر گیا تو اس نے کہا :

"میں تجھے سب لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں"

اس آیت میں "کلمات" سے کیا مراد ہے ؟ اس سلسلہ میں متعدد اقوال مروی ہیں۔ علامہ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ "کلمات سے مراد شرائع، اوامر اور نواہی ہیں۔ اور ان کو پورا کر دکھانے کا مطلب یہ ہے کہ انہیں جس چیز کی بھی ہدایت کی گئی جس کام کا بھی حکم دیا گیا اور جس بات سے بھی روکا گیا انہوں نے ٹھیک ٹھیک اس کے مطابق عمل کیا اور اچھے طریقے سے سرانجام دیا۔ ان کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی کی نہ کسی سستی کا مظاہرہ کیا۔ اس معنی میں سورۃ النجم کی آیت نمبر ۳۷ "وابراھیم الذی وفی" ہے یعنی جو حکم بھی دیا گیا اس کی انہوں نے ٹھیک ٹھیک بجاآوری کی۔ عبادت کے کسی موقع پر کوئی چیز ان کی راہ میں خارج نہ ہوپاتی تھی" (۲۱)

منصب امامت سے سرفراز کئے جانے کے بعد بھی ان کی اطاعت و فرماں برداری میں ادنیٰ سا فرق نہیں آیا۔ بلکہ وہ ہمہ وقت اپنے تمام کاموں' آرزوؤں' دعاؤں اور حرکات و سکنات میں مرضیٔ رب کو پیش نظر رکھتے تھے۔ اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ جب امامت کی بشارت پاکر انہوں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی یہ شرف آئندہ ان کی نسل کو بھی حاصل رہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں واضح کر دیا کہ جو لوگ کفر و شرک میں مبتلا ہو کر ظلم کا ارتکاب کریں گے اس عہد کا ان سے کوئی تعلق نہ ہوگا (البقرہ : ۱۲۵) تو اس فیصلۂ الٰہی کو

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے ذہن میں اس حد تک مستحضر رکھا کہ جب انہوں نے مکہ کے باشندوں کے لئے غذائی ضروریات کی فراوانی کی دعا کی تو پہلے ہی صراحت کر دی کہ میری یہ دعا صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو اللہ اور روز آخر پر ایمان لائیں (البقرہ : ۱۲۶) اس سے حضرت ابراہیمؑ کے بلند مرتبۂ تسلیم و رضا کا اندازہ ہوتا ہے کہ اگر انہیں اشارہ بھی مل گیا کہ فلاں سمت میں رب کی رضا ہے تو فوراً ادھر چل پڑے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے وضاحت کر دی کہ امامت پر معیشتِ دنیا کے معاملات کو قیاس کرنا صحیح نہیں۔ ایمان کی تخصیص صرف امامت کے معاملے میں ہے۔ جہاں تک روزی کا سوال ہے اس سے اللہ تعالیٰ اہل ایمان اور اہل کفر دونوں کو نوازتا ہے (البقرہ : ۱۲۶) ۲۲۔

۳۔ استغفار و انابت :

اللہ تعالیٰ سے اس درجہ قربت رکھنے اور اس کے ایک ایک اشارہ کی فوراً تعمیل کرنے کے باوجود حضرت ابراہیمؑ کو ہمہ وقت احساس رہتا تھا کہ کہیں ان سے فرائض کی انجام دہی میں کوئی کوتاہی نہ ہو گئی ہو۔ یہ احساس انہیں توبہ و استغفار اور رجوع و انابت پر آمادہ کرتا تھا۔ یہ ایک اعلیٰ ترین صفت ہے جو کسی مومن بندے میں پیدا ہو سکتی ہے۔ قرآن میں حضرت ابراہیمؑ کا ایک یہ وصف بھی بیان کیا گیا ہے :۔

اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ (ھود : ۷۵)

حقیقت میں ابراہیمؑ بڑا حلیم اور نرم دل آدمی تھا اور ہر حال میں ہماری طرف رجوع کرتا تھا۔

لفظ 'منیب' 'نوب' سے مشتق ہے۔ اسکے معنی ہیں کسی چیز کا بار بار پلٹنا۔ شہد کی مکھی کے لئے عربی زبان میں ایک لفظ 'نوب' بھی آتا ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ بار بار اپنے چھتے کی طرف پلٹ کر آتی ہے۔ اللہ کی طرف انابت کا مطلب ہے توبہ و استغفار کے ذریعے اس کی طرف رجوع کرنا اور اخلاص کے ساتھ اس کے احکام کو بجالانا" (۲۳)

حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کے سامنے توحید کی دعوت پیش کی اور اللہ تعالیٰ کے احسانات گنوائے تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ مجھے اس سے اپنی مغفرت کی توقع ہے :

وَالَّذِيْ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓئَتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ (الشعراء : ۸۲)

اور جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ روز جزا میں وہ میری خطا معاف فرمادے گا۔

وہ نہ صرف اپنے لئے بلکہ اپنے والدین اور تمام اہل ایمان کے لئے بھی مغفرت اور بخشش کی دعا کرتے تھے :

رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ٥ (ابراھیم : ۳۸)

پروردگار مجھے اور میرے والدین کو اور سب ایمان لانے والوں کو اس دن معاف کر دیجیو جب کہ حساب قائم ہوگا۔

اس اعلیٰ ترین صفت کا پر تو حضرت ابراہیمؑ پر ایمان لانے والوں میں بھی نظر آتا تھا۔ چنانچہ ان کی طرح وہ بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جبینِ نیاز خم کرتے، اس کی طرف رجوع ہوتے اس سے مدد چاہتے اور اپنے گناہوں اور لغزشوں پر اس سے مغفرت طلب کرتے تھے۔ ان کی دعا یہ ہوتی تھی :

رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ہ رَبَّنَا لاَ تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ اغْفِرْلَنَا رَبَّنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ٥(الممتحنہ : ۴)

اے ہمارے رب : تیرے ہی اوپر ہم نے بھروسہ کیا اور تیری ہی طرف ہم نے رجوع کر لیا اور تیرے ہی حضور ہمیں پلٹنا ہے۔ اے ہمارے رب ہمیں کافروں کے لئے فتنہ نہ بنادے۔ اور ہم سے درگذر فرما بے شک تو ہی زبردست اور دانا ہے۔

۴۔ شکر

اللہ تعالیٰ کے احسانات و انعامات کا احساس بندے میں شکر کا جذبہ پیدا کرتا ہے اور اس میں مزید تذلل، خشوع و خضوع اور اطاعت و فرمانبرداری پروان چڑھتی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے اندر یہ صفت بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی۔ ان کا دل اپنے رب کی نعمتوں پر تشکر و امتنان کے جذبات سے لبریز رہتا تھا۔ جس کا اظہار ان کی زبان سے بھی ہوتا تھا۔ قرآن کہتا ہے :

شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ (النحل: ۱۲۱)

اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والا تھا۔

نعم'' جمع قلت کا صیغہ ہے۔ اس سے یہ لطیف اشارہ مقصود ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اس وقت بھی اللہ کے شکر گذار تھے جب وہ ابھی زیادہ انعامات الٰہی سے بہرہ ور نہیں ہوئے تھے (۲۴)

اگر کسی شخص پر انعام و اکرام کی بارش ہو جائے تب وہ اپنے محسن کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہو تو اس میں کوئی ندرت نہیں ہے۔ قابلِ تعریف تو وہ شخص ہے جو معمولی احسان کو بھی مانے اور قلیل نعمتوں میں بھی شکر گذار ہو۔

حضرت ابراہیمؑ کی قوم آباء و اجداد کی تقلید میں بتوں کو پوجتی تھی۔ آپؑ نے اس کے سامنے توحید کی دعوت پیش کی۔ اس موقع پر آپؑ نے اپنی مثال دی کہ میں تو رب العالمین کی پرستش کرتا ہوں جس نے مجھ پر نت نئے احسانات کئے ہیں۔ ان احسانات کا تقاضا ہے کہ صرف اسی کی عبادت کی جائے :۔

فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْ اِلاَّ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ ۝ وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ ۝ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ ۝ وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ ۝ وَالَّذِیْ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ (الشعراء: ۷۷ تا ۸۲)

میرے تو یہ سب دشمن ہیں۔ سوائے ایک رب العالمین کے۔ جس نے مجھے پیدا کیا پھر وہی میری رہنمائی فرماتا ہے۔ جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے جو مجھے موت دے گا اور پھر دوبارہ مجھ کو زندگی بخشے گا اور جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ روز جزا میں وہ میری خطا معاف فرمادے گا۔

آپؑ نے قوم کو بھی متوجہ کیا کہ جو اسباب زندگی تمہیں حاصل ہیں وہ ان کی طرف سے نہیں ہیں جن کی تم پرستش کرتے ہو بلکہ ان سے تمہیں اللہ تعالیٰ نے نوازا ہے۔ اس لئے اس کا شکر ادا کرو اور صرف اسی کی عبادت بجالاؤ۔

اِنَّ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا یَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ط اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ (العنکبوت: ۱۷)

در حقیقت اللہ کے سوا جن کی تم پرستش کرتے ہو وہ تمہیں کوئی رزق بھی دینے کا اختیار نہیں رکھتے۔ اللہ سے رزق مانگو اور اسی کی بندگی کرو اور اس کا شکر ادا کرو۔ اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو۔

اپنے وطن سے ہجرت کے وقت تک حضرت ابراہیمؑ کی کوئی اولاد نہ تھی۔ ان کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ ان کے یہاں کوئی بچہ ہو جو ان کے کاموں میں مددگار بڑھاپے کا سہارا اور ان کی دعوت کو جاری رکھنے والا ہو۔ انہوں نے بارگاہِ الٰہی میں دعا کے لئے ہاتھ پھیلا دیئے (الصافات: ۱۰۰) اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو شرفِ قبولیت بخشا اور انہیں دو اولادیں عطا کیں۔ حضرت ہاجرہ سے اسماعیلؑ اور حضرت سارہ سے اسحاقؑ پیدا ہوئے۔ دعا کی مقبولیت پر حضرت ابراہیمؑ کا دل جذبۂ تشکر سے بھر گیا جس کا اظہار ان کی زبان مبارک سے یوں ہوا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَی الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ (ابراھیم: ۳۹)

شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے اس بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق جیسے بیٹے دیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا رب ضرور دعا سنتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کو مکہ کی وادی میں لا بسایا تھا۔ اس وقت وہ جگہ بالکل غیر آباد تھی۔ سنگلاخ زمین کی وجہ سے سبزہ اگتا تھا نہ پیداوار ہوتی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی

کہ اس ویرانے کو آباد کر دے اور وہاں کے باشندوں کے لئے اسبابِ معاش کی فراوانی کر دے :

رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَھْوِیْ اِلَیْھِمْ وارْزُقْھُمْ مِنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّھُمْ یَشْکُرُوْنَ (ابراھیم: ۳۷)

پروردگار میں نے ایک بے آب وگیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے۔ پروردگار میں نے یہ اس لئے کیا ہے کہ یہ لوگ یہاں نماز قائم کریں۔ لہذا تو لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا اور انہیں کھانے کو پھل دے۔ تاکہ یہ شکر گذار بنیں۔

آیت کے آخر میں لَعَلَّھُمْ یشکرون کے جو الفاظ آئے ہیں وہ نہایت معنی خیز ہیں۔ یعنی میں ان کے لئے جو سکون کی زندگی Settled Life کا طالب ہوں تو اس لئے نہیں کہ ان کے لئے سامان عیش کی فراوانی چاہتا ہوں بلکہ صرف اس لئے اس کا طالب ہوں کہ وہ اپنے مشن کے لئے یکسو رہ کر زیادہ تیری شکر گذاری کا حق ادا کر سکیں (۲۵)

☆☆☆

قلبِ قرآن

۳۔ سورہ یٰس قرآن کا دل ہے اور قرآن ریحانہ ہے اور یہ ماہِ خدا کے قلب میں عالم امکان کے قلب پر یکبارہ نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ انزال دفعی ہے اور تنزیل تدریجی۔ یہ امامِ قرآن ہے اور قرآن امام اور دونوں ریحانہ ہیں۔